ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۶
جون ۲۰۰۹ء/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ

سرپرست
حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارِعرفات)

نگران
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارِعرفات)
مولانا احمد علی حسنی ندوی مدظلہ
(ڈائریکٹر، دارِعرفات)

مجلس ادارت
بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت
محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ: ۷ روپے سالانہ: ۷۰ روپے
اعزازی (سالانہ) ۵۰۰ روپے

مرکز الامام أبی الحسن الندوي
دار عرفات ،تکیہ کلاں
رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱

E-Mail: alnadwi@yahoo.com

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس ، اے ، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں ، سبزی منڈی ، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات''، مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خود غرضی کی آگ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

الیکشن آئے اور گئے، کوئی آیا کوئی گیا، ہمیشہ الیکشن کی یہی کہانی ہے لیکن اس سے ملک اور سماج کو کیا ملا، یہ سوچنے کی چیز ہے، سماج کی جو خرابیاں پہلے سے تھیں وہ جوں کی توں موجود ہیں، ظلم، خودغرضی اور مفاد پرستی کا جو ماحول پہلے تھا وہ اب بھی ہے، مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت میں شاید اور اضافہ ہی ہوا، الیکشن کے دوران وعدوں کی بھرمار، ایک دوسرے پر الزامات کا ایک لامتناہی سلسلہ، سیاہ وسپید کی کہانیاں، ووٹروں کو لبھانے کے لیے طرح طرح کے اشتہارات، معلوم ہوتا تھا کہ ملک دو خانوں میں بٹا ہوا ہے، ایک دوکاندار دوسرا گاہک، ملک کے اتحاد وسالمیت کی، سماج کو بہتر بنانے کی فکر کرنے والے کتنے تھے ان کو شاید انگلیوں پر گننا مشکل ہو، یقیناً یہ چیزیں ملک کے لیے کسی خطرہ سے کم نہیں۔

الیکشن کے دوران معلوم ہوتا تھا کہ خودغرضی کی آگ لگی ہوئی ہے، ہر ایک کو اپنی کرسی کی فکر ہے، اس کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، ہر الیکشن اپنے پیچھے خودغرضی اور فرقہ بندی کا ایسا ماحول چھوڑ جاتا ہے جس کا تجربہ چھوٹے بڑے پیمانے پر ہر ایک کو ہوتا ہے، اس کے بعد دشمنیاں نکالی جاتی ہیں، اور بعض مرتبہ آپس کی محبت کا جو ماحول بڑی محنتوں کے بعد بنتا ہے الیکشن کی نذر ہو جاتا ہے، اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج بگڑ گئے ہیں، برائی کو برائی سمجھنے والے کم ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس سے بڑھ کر خطرہ کی بات یہ ہے کہ برائی کو برائی کہنے والے ختم ہوتے جارہے ہیں۔

برائیاں کس سماج میں نہیں ہوتیں لیکن ان کو برائی سمجھا جاتا ہے اور اس کو برائی کہنے والے موجود رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں اس کا فیصد (Ratio) بڑھنے نہیں پاتا، آج ہمارے موجودہ سماج کے لیے سب سے بڑی خطرہ کی بات یہ ہے کہ وہ برائیاں جن کو ایک زمانہ میں بہت معیوب سمجھا جاتا تھا آج وہ معزز اور شریف گھرانوں میں عام طور پر داخل ہوگئی ہیں اور ان کو روکنے والے اور ان کو برا کہنے والے خال خال رہ گئے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ رشوت کو بڑی بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، کام کرنے والوں میں ایک طرح کی امانت تھی، وہ دوسرے کا کام کرکے خوش ہوتے تھے، ایک دوسرے کا دکھ درد لوگوں کے دلوں میں تھا لیکن اب صورت حال یہ بن گئی ہے کہ جس کام کی تنخواہ مل رہی ہے وہ کام بھی اس وقت لوگ کرنے کو تیار نہیں ہوتے جب تک کام کرانے والا ان کی جیب گرم نہ کردے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بارہ دری لکھنؤ کی ایک تقریر میں بڑے جوش سے فرمایا تھا: ''کام کرنے والے کی نگاہ ٹوٹے ہوئے دل پر نہیں ہوتی اس کی نگاہ جیب پر ہوتی ہے کہ اس میں کوئی نوٹ جھانک رہا ہے یا نہیں''۔

واقعہ یہ ہے کہ رشوت کو اب رشوت ہی نہیں سمجھا جاتا، اس کو کہیں ''نذرانہ'' کا نام دیا جاتا ہے اور کہیں ''بالائی آمدنی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اب تو اس کو برا کہنے والے بھی رخصت ہوئے جارہے ہیں اور کہے بھی تو کون کہے اوپر سے نیچے تک آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، اس کو باقاعدہ نظام کا ایک جزء بنادیا گیا ہے، حدیث میں ایک جگہ صاف صاف کہا گیا ہے: **"الراشي والمرتشي كلاهما في النار"** (رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں)، اس میں مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بڑی عبرت ہے۔

اس وقت دیکھا جائے تو بہت سی برائیاں مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کے نتیجہ میں پیدا ہورہی ہیں، ظلم، خودغرضی، مفاد پرستی ہر چیز کے پیچھے اگر دیکھا جائے تو یہی مال کی محبت نظر آتی ہے، ایک حدیث میں یہ کہا بھی گیا ہے کہ **"حب المال رأس كل خطيئة"** (مال کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے)۔

ملک کے دانشور طبقہ کی یہ بڑی ذمہ داری ہے کہ برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی جائے، برائی کو برائی کہا جائے، اور لوگوں کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کی جائے، ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ پورا ملک مال کی ہوس کے نتیجہ میں کہیں ایسے خطرہ میں نہ پڑ جائے کہ پھر اس سے اس کا نکالنا مشکل ہو جائے۔

ہزار ترقیوں کے باوجود اگر کسی ملک میں ظلم، ناانصافی یا سماج کی برائیاں موجود ہوں تو وہ بہت دنوں تک پنپ نہیں سکتا، تاریخ بتاتی ہے کہ بعض بعض مرتبہ ان برائیوں نے پورے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے پھر دنیا کے نقشہ میں اس کی کوئی پہچان باقی نہ رہ سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ الیکشن کے دوران سیاسی پارٹیاں اور ان کے قائدین اور کارکنان جو انتھک محنت کرتے رہے اگر اس کا عشر عشیر بھی سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے کرلیا جائے تو پورے ملک کا منظرنامہ بدل سکتا ہے۔

احکام الٰہی کی پابندی اور حسن تدبیر
مسلمانوں کی سربلندی کا ذریعہ

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ ، اسلام اور اس کے معاندین کے درمیان کشمکش سے بھری ہوئی ہے، مسلمانوں کو اس کے نتیجہ میں عروج اور زوال دونوں حالات سے گزرنا پڑا ہے، اللہ تعالی کی طرف سے اس امت کو بقاوعزت کا مقام حاصل ہے جو اس کو برابر ملتا رہے گا البتہ وہ آزمائشوں سے بھی گزرتی رہی اور ابھرتی رہی ہے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی چل سکتا ہے، لیکن اس کو کلی اور حتمی طور پر زوال کہیں پیش نہیں آیا، یہ کبھی کسی ایک علاقہ میں، کبھی دوسرے علاقہ میں، اور کبھی کسی ایک مدت، کبھی کسی دوسری مدت میں پیش آتا رہا ہے، جس کے اثرات سے یہ امت وقتی طور پر سخت حالات سے گزرتی رہی، لیکن اس کے باوجود رواں دواں رہی ہے اور عالمی برادری میں اپنی قابل ذکر جگہ بناتی رہی ہے، اور اب موجودہ حالات میں بھی اس کے ابھرنے اور باعزت مقام حاصل کرنے کی پوری توقع ہے، اگر ایسا نہ ہوتا رہا ہوتا تو آج وہ جس تعداد میں اور جن مادی اور معنوی دولتوں سے مالا مال ہے، نہ ہوئی ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام ومسلمانوں کے معاندین کے دلوں میں اس امت سے حسد اور اس سے جذبۂ عداوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور دنیا کی یہ دیگر قومیں اپنی اپنی جگہ پر اور عالمی پیمانہ پر بھی مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی حیثیت وعظمت سے برابر پریشانی محسوس کررہی ہیں اور مسلمانوں کو کمزور کردینا چاہتی ہیں حالانکہ اسلام مسلمانوں کے دلوں میں انسانی ہمدردی اور سب انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کا ایسا انسانی جذبہ جاگزیں کرادیتا ہے جو دوسروں کو بلاسبب کسی طرح کا نقصان پہنچانے سے ان کو باز رکھتا ہے، مزید یہ بات بھی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالی نے کسی دیگر مذہب والے کے مذہب کو بالجبر بدلنے سے منع کررکھا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار وحال عروج وقوت میں بھی کسی کو اپنے مذہب کو چھوڑنے اور اسلام اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا، ہاں اسلام یہ ضرور تاکید کرتا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کی معرفت اور حق سے جو آگہی ہوئی ہے وہ دوسروں کو بھی بتائے اور ان تک پہنچائے اور اسلام نے ان کو اس بات کی صرف تاکید ہی نہیں کی ہے بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے اس بات پر نصرت اور مدد کا وعدہ بھی ہے چنانچہ اللہ تعالی کی نصرت اور مدد جب کبھی مسلمانوں سے ہٹی ہے ان کی اس عمل میں کوتاہی اور دین واخلاق فاضلہ کی پابندی میں کمی کی بنا پر ہٹی ہے اور چونکہ دین کی نصرت یعنی اللہ تعالی کے حکموں کی پابندی اور دعوت حق کی بنیاد پر اللہ تعالی نے مسلمانوں سے اپنی اسی نصرت کا وعدہ کیا ہے، لھذا مسلمانوں کو جب بھی بحیثیت امت کے زوال ومصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے تو مذکورہ بالا ہدایت میں کوتاہی کی وجہ سے سامنا کرنا پڑا ہے، اس لیے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کی مصیبتوں کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی طرف سے احکام الٰہی کی پابندی اور حسن تدبیر میں ہونے والی کوتاہی ہی بنتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اسلام ان کو یہ بالکل نہیں سکھاتا کہ وہ غیروں کو بلاسبب کوئی تکلیف دیں یا ان کو نقصان پہنچائیں بلکہ ان کے ساتھ اخلاق ورواداری اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کا اس پر عام طور پر عمل بھی ہے، مگر افسوس ہے کہ اسلام کے سلسلہ میں اس کے مخالفوں نے یہ مغالطہ پھیلایا ہے کہ وہ جبر وزور زبردستی کا مذہب ہے اور قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ دینے کی کوشش کی ہے جن میں قرآن مجید کے نزول کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ مکہ کے کفار ومشرکین کی طرف سے تیرہ چودہ سال تک مسلسل دشمنی کرتے رہنے اور اس پر ان کے مسلسل صبر کرنے کے بعد بھی ان کے ان دشمنوں کی طرف سے اور حملہ آور ہوکر ان سے باقاعدہ جنگ کرنے پر بالآخر ان کے ظلم کا سخت جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ کسی ملک کا دشمن اس ملک پر حملہ آور ہو اور جانی ومالی نقصان پہنچائے تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس دشمن کو مارو، قرآن مجید کی آیات کو صحیح طور پر نہ پڑھنے اور نہ سمجھنے کی صورت میں اسلام پر تشدد کا غلط الزام لگایا جاتا ہے، قرآن مجید میں صراحۃً یہ حکم بھی آیا ہے کہ دشمن کے ساتھ زیادتی نہ کرو صرف جتنا ظلم اسی نے کیا اسی حد تک اس سے بدلہ لو، اور یہ بھی آیا ہے کہ کوئی مشرک (کافر) تمہارے پاس آجائے تو اس کو مہمان کی طرح رکھو تاکہ وہ اللہ تعالی کا کلام سن سکے پھر اس کو امن وحفاظت سے اس کی حفاظت کی جگہ تک پہنچادو، دراصل قرآن مجید کو اس کے صحیح سیاق وسباق کے ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کے مخالفین اپنی من مانی تفسیر کرتے ہیں، یہ علمی بددیانتی بھی ہے اور حقائق کو بدل کر پیش کرنے کی حرکت بھی ہے جو بظاہر جان بوجھ کر کی جارہی ہے اس لیے اس پر افسوس و نفرت کا ہی اظہار کیا جاسکتا ہے، اسلام کی تعلیمات کا انسانی بہی خواہی و ہمدردی کا رویہ جو قرآن مجید اور اسلام کے پیغمبر ﷺ کی احادیث سے صاف طریقہ سے سامنے آتا ہے اس کو نظر انداز کردینا، یہ اس کے مخالفین کا بڑا ظلم ہے، مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ افہام وتفہیم کے مفید ومؤثر ذرائع کو اختیار کرتے ہوئے ان لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں جو ایسی غلط تشریحات سے متاثر ہوکر غلط فہمیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غیروں کے تاثر کو صحیح کریں، اس کے لیے ذرائع ابلاغ اور مخلوط سیمینار اور سیمپوزیم کے وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی زندگیوں کو ان صفات اور اخلاق سے آراستہ بھی کرنا چاہیے جن سے وہ اللہ تعالی کی مدد ونصرت کے مستحق ہوں، غلط عادتیں، جاہلانہ رسوم اور بے ضرورت نام ونمود کا شوق، اور شہرت پسندی سے گریز کرتے ہوئے ان کو اچھے کردار اور اسلامی اخلاق وسیرت کو اختیار کرنا چاہیے، اور اسی کے ساتھ داعیانہ رویہ بھی اختیار کرنا چاہیے کیونکہ اسی صورت میں اللہ رب العالمین سے ان کو نصرت اور خصوصی مدد حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے زوال سے محفوظ رہتے ہوئے وہ عروج وغلبہ حاصل کرسکتے ہیں۔

بے حیائی
نتائج و مضمرات

بلال عبدالحی حسنی ندوی

یہودی پروٹوکول میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ ''ہم دنیا میں جنسی انارکی کا ایسا بحران پیدا کردیں گے کہ لوگ پوری طرح کرپٹ ہوکر رہ جائیں گے، اخلاق کے پیمانے بدل جائیں گے، دماغ کھوکھلے ہوکر رہ جائیں گے پھر پوری دنیا میں ہماری ہی حکومت ہوگی''۔ یہ وہ خطرناک منصوبہ بنایا گیا تھا جس کو بروئے کار لانے کے لیے دنیا کی بڑی طاقتیں مصروف عمل ہیں، اکثر شعوری طور پر کچھ لاشعور میں بھی، اس بحران کو گھر گھر داخل کرنے کے لیے اس کو تعلیم کا جزء بنادیا گیا ہے اور ثقافت کے نام سے بڑی اہمیت دی جانے لگی ہے۔

سب سے پہلے یہ بحران یورپ و امریکہ میں شروع ہوا، آزادی کے خوبصورت نام پر لوگوں کو صرف عام چھوٹ ہی نہیں دی گئی بلکہ ایسے پروگرام تیار کیے گئے کہ ایک سادہ ذہن رکھنے والا بھی ادھر متوجہ ہوجائے، مرد وزن کے اختلاط کو عام کردیا گیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''حیا'' کا لفظ ان کی ڈکشنری سے نکل گیا، خاندانی نظام مفلوج ہوکر رہ گیا اور کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں صحیح النسب لوگوں کا تناسب اس قدر گھٹ گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں آبادی کا تناسب اتنا گرتا جارہا ہے کہ اب اس کو وہاں تشویش کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔

مشرقی دنیا جہاں کسی درجہ اب تک حیا باقی تھی اب بہت تیزی کے ساتھ بے حیائی کا طوفان یہاں بھی داخل ہورہا ہے، اس میں بہت کچھ دخل میڈیا کا ہے، الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں نے اس کے لیے کمر کس لی ہے اور چونکہ زیادہ تر یہ ایجنسیاں یہودیوں کے زیر اثر ہیں اس لیے یہ ان کے کاز میں داخل ہے، دوسری طرف یہاں کے تعلیمی اداروں نے بھی یورپ کی نقالی میں وہیں کی ثقافت اختیار کرنی شروع کردی ہے، متعدد کالجوں اور اسکولوں میں ایسا لباس لازم کردیا گیا ہے جس کو پوری طرح لباس کہنا بھی مشکل ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عمومی طور پر زنا اور بدکاری جیسی بیماریاں سماج میں داخل ہوتی جارہی ہیں اور اس کا خطرہ پیدا ہورہا ہے کہ یورپ و امریکہ جس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہیں وہی مصیبت کہیں ان مشرقی ملکوں پر بھی نہ آپڑے۔

جس طرح چیزوں کی خصوصیات و اثرات طے شدہ ہیں، آگ کی اپنی خصوصیات ہیں، پانی کا اپنا کام ہے اور دنیا کی تمام چیزیں اپنی اپنی خصوصیات رکھتی ہیں، اور اس کے نتائج سامنے آتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے افعال کے بھی خواص رکھے ہیں، جن کو فوری طور پر خواہ ظاہر بیں نگاہیں نہ دیکھ سکیں لیکن وہ ایک حقیقت کی شکل میں سامنے آتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے متعدد گناہوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کا وبال دنیا میں مختلف شکلوں میں سامنے آتا ہے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''**لم تظهر الفاحشة في قوم قط حتىٰ يعلنوا بها إلا فشا فيهم الطاعون و الأوجاع التى لم تكن مضت في أسلافهم الذين مضوا**'' (جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے یہاں تک کہ وہ لوگ علی الاعلان اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو ان میں طاعون اور ایسی ایسی بیماریاں پھیلتی ہیں جن سے ان کے گذرے ہوئے لوگوں کا واسطہ بھی نہیں پڑا تھا)۔

آپ ﷺ کا ارشاد آج ایک حقیقت کی شکل میں سامنے ہے، بیماریوں کی ایسی ایسی شکلیں سامنے آرہی ہیں کہ جن کا پہلے تصور بھی نہ تھا، ابھی دنیا ایڈس (AIDS) کے موذی مرض کا علاج بھی دریافت بھی نہ کرسکی تھی کہ دوسرے نئے نئے امراض ایسے سامنے آنے لگے جن کے بارے میں پہلے کسی نے سوچا بھی نہ تھا، سوائن فلو (Swine Flu) نام کی بیماری سے اس وقت پورا امریکہ اور یورپ خوف زدہ ہے، یہ بیماری تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، ابھی تک اس کا تجزیہ پوری طرح نہیں ہوسکا ہے اور نہ کوئی علاج دریافت ہوا ہے۔ عام طور پر یہ بیماریاں یورپ اور امریکہ سے شروع ہوتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اور ملکوں میں پھیلتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ ہی اس وقت زنا اور بدکاری کے مراکز ہیں اور ان کو وہاں عام طور پر برائی نہیں سمجھا جاتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں طرح طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔

جب بھی فطرت سے بغاوت کی جائے گی تو اس کے یہی نتائج سامنے آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جنسی خواہش رکھی ہے اور اس کی تسکین کے لیے نکاح کا طریقہ بھی تجویز کیا ہے اور اس کو توالد و تناسل کا ذریعہ بنایا ہے، جب انسان نے اس سے بغاوت کی تو وہ عذاب الٰہی کا شکار ہوا، حضرت لوطؑ کی قوم پر اسی لیے عذاب آیا، آج ترقی یافتہ دنیا بے حیائی کی نئی نئی شکلیں دریافت کرنے میں لگی ہے، کہیں ''ہم جنس پرستی'' کو قانونی شکل دی جارہی ہے، اور کہیں مرد وزن کے اختلاط کی ایسی ایسی شکلیں اختیار کی جارہی ہیں کہ اس کے بعد پھر برسرِ عام وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ایک شریف انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ایک واقعہ کی شکل میں سامنے ہے، طرح طرح کے موذی امراض پھیل رہے ہیں اور انسان ان کی دواؤں کی دریافت میں لگا ہوا ہے، ان کے علاج کے لیے جدید سے جدید ٹکنالوجی استعمال کی جارہی ہے، لیکن اس کا جائزہ لینے کی فرصت کس کو ہے کہ اس کے پیچھے کیا ہے؟ کون سے وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ صورت حال پیدا ہورہی ہے، جب تک اس منفذ کو بند نہیں کیا جائے گا، نئی نئی بیماریاں وجود میں آتی رہیں گی، ایک بیماری کا علاج اگر دریافت کر بھی لیا گیا ہے تو اس کے آگے بیماریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، اور یہ صرف فطرت سے بغاوت کا نتیجہ ہے! جب تک اس سلسلہ کو بند نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک انسان اپنے لیے گڑھا کھودتا رہے گا اور گرنے والے اس میں گرتے رہیں گے!!

ملت ابراھیمی
قرآن کریم کی روشنی میں

عبدالسبحان ناخدا ندوی

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ملت ابراہیمی سب سے بہترین ملت ہے، "خیر الملل ملة ابراهيم"۔ ملت درحقیقت اس خاص طریقہ کو کہتے ہیں جو اللہ رب العزت اپنے انبیاءؑ کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کے لیے جاری کرتا ہے، اس لحاظ سے ملت قریب قریب دین وشریعت کا مفہوم رکھتا ہے، اس لفظ کی نسبت حضرات انبیاءؑ کی طرف رکھی گئی ہے، بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کی ملت کو اختیار کرنے کا حکم امت محمدیہ کو بہت تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے: "ملة ابيكم ابراهيم هو سماكم المسلمين من قبل و في هذا" (اپنے باپ ابراہیم کی ملت کو اختیار کئے رہو، اللہ نے تمہیں "مسلمین" کا لقب عطا کیا ہے، اس کلام میں اور گزری ہوئی کتابوں میں بھی)، ایک طرف اللہ رب العزت نے ملت ابراہیمی کو تھامے رہنے کا حکم دیا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کو نادان قرار دیا ہے جو ابراہیمی ملت سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں رکھتے: "ومن يرغب عن ملة ابراهيم الا من سفه نفسهٗ (ملت ابراہیمی سے وہی شخص لاتعلق رہے گا جو خود اپنے آپ کو احمق وجاہل قرار دے)

ہر انسان جو یہ مبارک آیات تلاوت کرتا ہے اس کے ذہن میں یہ سوال ضرور قائم ہوگا کہ آخر ملت ابراہیمی وہ کون سی عظیم نعمت ہے جس کو تھامے رہنے کی قرآن کریم نیاس درجہ تاکید فرمائی ہے اور جس سے دور دور رہنے والوں کو نادان واحمق قرار دیا ہے، قرآن کریم میں غور کرنے سے خود اس کا جواب بھی آسانی سے مل جائے گا اور ملت ابراہیمی کے خدوخال واضح ہوجائیں گے۔

قرآن کریم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ملت ابراہیمی نام ہے مکمل خودسپردگی کا، اس حد تک کہ انسان اپنی ذات، اپنے احساسات، اپنی خواہشات اور اپنے عزائم سب ایک اللہ کے لیے نچھاور کردے، حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی خودسپردگی سے عبارت ہے، کعبۃ اللہ کی تعمیر کے دوران حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو ساتھ لے کر کچھ دعائیں مانگی تھیں، وہی دعائیں درحقیقت ابراہیمی ملت کا نقشہ سامنے رکھتی ہیں ان میں ایک دعا یہ ہے: "ربنا و اجعلنا مسلمين لك و من ذريتنا امة مسلمة لك" (اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں (باپ بیٹے) کو ایسا بنادے کہ ہم اپنے آپ کو مکمل تیرے حوالہ کردیں اور ہماری اولاد میں ایک ایسی امت پیدا فرماں جو صرف تیری تابع فرمان ہو)، بات صرف دعا کی حد تک نہیں رہی بلکہ اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کو عملاً اس کا حکم فرمایا کہ اے ابراہیم! اپنے آپ کو صرف ہمارے حوالہ کردو: "اذ قال لهٗ ربهٗ أسلم" ، حضرت ابراہیمؑ ہر طرح کے امتحانات سے گزر چکے تھے، فوراً بول اٹھے: "أسلمت لرب العالمين" (میں تو سراپا رب العالمین کے حوالے ہوں)۔ یہی درحقیقت ملت ابراہیمی ہے، کامل سپردگی، مکمل فنائیت، مسلسل قربانی، اپنے خالق ومالک سے والہانہ وابستگی، اللہ کی محبت کے راستہ میں رکاوٹ بننے والی ہر محبت سے دست برداری، اس کے ساتھ کامل اعتدال اور توازن، جسے اختیار کرنے والی امت کو "امتِ وسط" کہتے ہیں، قرآن کریم نے ایک جگہ اس کی تشریح یوں کی ہے: "قل إنني هداني ربي---------- وأنا أول المسلمين" (اے محمد ﷺ کہیے: میرے رب نے مجھے نہایت صحیح راستے پر چلایا ہے، نہایت درست ترین طریقہ یعنی ابراہیم کی ملت پر مجھے قائم ودائم رکھا ہے، وہی ابراہیم جو سب سے کٹ کر ایک اللہ کے ہورہے تھے، وہ مشرک نہ تھے (بلکہ سچے مؤمن تھے)، آپ کہیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب ایک اللہ کے لیے وقف ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم ہے، اور میں سب سے پہلے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں)۔

ہر انسان کی فطرت میں اللہ رب العزت نے اپنے آپ کی تلاش وجستجو رکھی ہے، یہ پیاس دنیا جہاں کی راحت پاکر بھی نہیں بجھتی ہے، ملتِ ابراہیمی درحقیقت انسان کی اپنی یافت ہے، یہ وہ آبِ حیات ہے جو اس کی فطری پیاس کو تسکین بخشتا ہے، پیاسا دل یہاں سیراب ہوتا ہے، تھکا ماندہ دماغ یہاں سے توانائی پاتا ہے، بے مقصد زندگی یہاں پہنچ کر اپنا رخ متعین کرتی ہے، اور کیا خوب متعین کرتی ہے! "فأقم وجهك للدين حنيفاً" (اپنے رخ کو دین کے لیے یکسو ہوکر سیدھا کرلو) "فطرة الله التي فطر الناس عليها" (اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کو دل وجان سے قبول کرلو، اسی پر اللہ نے لوگوں کی فطرتیں بنائی ہیں) "ذلك الدين القيّم" (یہی درحقیقت درست ترین دین ہے) "ولكنّ أكثر الناس لا يعلمون" (لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

اسی لیے ملتِ ابراہیمی یعنی سراسر خودسپردگی سے بعدر کھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے احمق وجاہل قرار دیا ہے، جو خود اپنا ہی مقصد پانہ سکا اس نے آخر کیا پایا؟ سب کچھ پاکر بھی وہ مفلس وقلاش ہی رہا! کیا اس سے بڑھ کر کوئی نادان ہوسکتا ہے جو ہر چیز کا ہدف متعین کرے لیکن اپنا کوئی ہدف متعین نہ کرے؟! یا مصنوعی چند اہداف مقرر کرکے اسی پر خوش ہو! جیسے بچہ شیشہ کے قیمتی گلاس توڑتا چلا جائے، اور اس پر خوش ہوتا رہے کہ گلاس ٹوٹنے کی آواز اسے نہایت بھلی محسوس ہورہی ہے!!

حضرت ابراہیم نے اپنی کل اولاد کو اسی ملت پر قائم رہنے کی تاکید کی تھی، آنے والی نسلوں میں کچھ کامیاب رہے، کچھ گمراہ ہوئے: "فمنهم من آمن به ومنهم من صدّ عنه"۔ اخیر میں نبی اکرم ﷺ کو مبعوث فرما کر ملتِ ابراہیمی کا تاج آپ کے سر پر سجا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اس امت پر تمام کردیں، جو شخص اس عظیم نعمت کو پالیتا ہے وہ اس کائنات میں اللہ کا گواہ بن کر زندگی بسر کرتا ہے، اس کی ایک ایک ادا یہ گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے لیے جینے مرنے والے کتنے پاکیزہ کیسے مقدس اور انسانیت کے کیسے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتے ہیں، خود حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں خداوند قدوس کی یہ گواہی سنیے: "إن ابراهيم لحليم أواه منيب" (ابراہیمؑ سراپا حلم تھے، بڑے آہ وزاری کرنے والے، اللہ کی طرف دل وجان سے متوجہ رہنے والے تھے)۔ اس ملت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں گواہی دی: "وما أرسلناك إلا رحمة للعلمين" (اے محمد! ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے) عام اہل ایمان جو ملت ابراہیمیؑ سے وابستگی رکھتے ہیں ان کا منصب یہ ہے: "ملة أبيكم إبراهيم هو سماكم المسلمين--الآية (اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت سے وابستہ رہو، اللہ نے تمہارا نام "المسلمین" رکھا ہے، پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ بنیں (اس لیے کہ وہ اول المسلمین ہیں) اور تم تمام لوگوں پر گواہ بن سکو)۔ یہ گواہی زبانی ہو کہ بے جھجک اپنے مسلم ہونے کا اعلان کرے اور اس پر فخر محسوس کرے، یہ گواہی قلبی وعملی بھی ہو کہ دل کا سچا اور عمل کا ستھرا ہو، اسی کو "محسن" کہتے ہیں، یہ گواہی دعوتی بھی ہو کہ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک بے کم وکاست پہنچا کر حجت تمام کردے۔ کیا ہم اس مطالبہ پر پورے اترتے ہیں؟؟

اسلامی نکاح

ارکان، شرائط اور مختصر احکام

مفتی راشد حسین ندوی

آنحضرت ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت اور طریقہ قرار دیا ہے، اور سنت سے روگردانی کرنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''، ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ کی خدمت میں چند حضرات صحابہ اس مقصد سے آئے کہ آپ کے شب و روز کا جائزہ لیں، اور اسی کے مطابق زندگی گزاریں، پھر انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے شادیاں کر رکھیں ہیں، رات میں آرام بھی فرماتے ہیں اور نوافل بھی پڑھتے ہیں، نفلی روزے کسی دن رکھتے ہیں، کسی دن نہیں رکھتے، ان کو یہ عبادات کم محسوس ہوئیں، لیکن انہوں نے خیال کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیے گئے ہیں، اس لیے آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ہم کو تو ضرورت ہے، چنانچہ کسی نے کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا، کسی نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا، کسی نے کہا کہ میں رات بھر نوافل پڑھوں گا، ان کی ان باتوں کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو ہوئی تو آپ نے ان باتوں پر ناراضگی ظاہر کی اور فرمایا: ''خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والا اور تقوی اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو میرے طریقہ سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ (متفق علیہ)

ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ نکاح کرنا آنحضرت ﷺ کے طریقہ کو اختیار کرنا ہے اور اس سے روگردانی دراصل آپ کے طریقہ کو چھوڑنا ہے جس میں سراسر گھاٹا ہے، بے برکتی اور بے آرامی ہے، نکاح کو ان احادیث میں آنحضرت ﷺ نے اپنا طریقہ اور سنت بتایا ہے، اس سے بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے فقہی اصطلاحی سنت مراد ہے جس کے کرنے پر ثواب ملتا ہے، نہ کرنے پر عتاب ہوتا ہے لیکن عذاب نہیں ہوتا، حالانکہ یہاں سنت کے لغوی معنی مراد ہیں نہ کہ اصطلاحی، جس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح آنحضرت ﷺ کا طریقہ ہے، جہاں تک اس کی فقہی حیثیت کا تعلق ہے تو یہ کبھی فرض ہوتا ہے کبھی واجب، کبھی سنت کبھی مستحب، بلکہ کبھی حرام اور مکروہ بھی ہو جاتا ہے، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں رغبت کی شدت کے سبب زنا میں پڑ جانے کا یقین ہو، ساتھ ہی وہ نان نفقہ پر قدرت رکھتا ہو اور اس کو بیوی پر ظلم کا اندیشہ نہ ہو تو نکاح کرنا اس پر فرض ہوگا، اور ظلم پر یقین ہو تو نکاح کرنا حرام ہوگا، بقیہ مراتب بھی اس کے حالات کے مطابق ہوں گے، عام اعتدال کی حالت ہو تو نکاح کرنا سنت ہوگا۔

نکاح انسان کو برے خیالات سے بچاتا ہے، گناہ سے محفوظ رکھتا ہے تو الدو تناسل کا ذریعہ بنتا ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے نوجوانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''نوجوانو! تم میں سے جس کو قدرت ہے اسے چاہیے کہ شادی کرے اور جس کو استطاعت نہیں ہے وہ روزے رکھے اس لیے کہ روزے اس کے لیے پاک دامنی کا ذریعہ بنیں گے۔ (متفق علیہ)

اسی وجہ سے اسلام نے نکاح کو بہت آسان اور سہل الوصول بنایا، خرچ کم سے کم رکھنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''برکت میں سب سے بڑھا ہوا نکاح وہ ہے جس کا خرچ سب سے کم ہو''۔ لیکن افسوس ہم مسلمانوں نے برادران وطن کی تقلید یا خود اپنی کوتاہ نصیبی کے سبب اسلام کے دوسرے احکام کی طرح اس حکم کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے اور نکاح میں ایسی ایسی رسومات کا اضافہ کر دیا ہے کہ جس سے اس کا خرچ بھی بلا کسی وجہ کے ایک عام آدمی کے بس سے باہر ہو گیا ہے اور اس میں ایسی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں کہ بغیر کسی مولوی کی مدد کے نکاح کا تصور کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے ورنہ شریعت نے نکاح میں ضروری صرف دو طرح کی چیزوں کو قرار دیا ہے، ان میں سے ایک کو نکاح کے ارکان کہا جاتا ہے اور دوسرے کو نکاح کی شرائط، ان پر غور کیا جائے تو معمولی پڑھا لکھا شخص بلکہ ان پڑھ بھی آسانی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے عمل کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

جہاں تک نکاح کے ارکان کا تعلق ہے تو یہ دو ہیں: ایجاب و قبول، ایجاب کا مطلب لڑکے یا لڑکی میں سے کسی کا یہ کہنا کہ میں تم سے نکاح کرتا ہوں، اور قبول کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا فریق کہے کہ میں قبول کرتا ہوں۔ یہ الفاظ چاہے فریقین خود کہیں چاہے کوئی کسی اور کو اپنا وکیل بنا دے اور اس کی طرف سے یہ الفاظ وکیل کہے، اگر خط و کتابت، ٹیلیفون، موبائل یا انٹرنٹ کے ذریعہ ایک فریق کسی کو وکیل بنا دے تب بھی ایجاب و قبول ہو جائے گا اور رکن نکاح پورا ہو جائے گا۔

جہاں تک نکاح کے خطبہ کا تعلق ہے تو آنحضرت ﷺ کا معمول چونکہ خطبہ دینے کا رہا ہے لہٰذا یہ سنت ہے کہ دیا جائے تو انشاء اللہ باعث برکت ہوگا، ورنہ بالاتفاق نہ دینے پر بھی نکاح ہو جائے گا جہاں تک اس موقع پر کلمہ اور دوسری عبارات پڑھوانے کے رواج کا تعلق ہے تو اس کا معمول نہ آنحضرت ﷺ کا تھا نہ صحابہ کرام یا سلف صالحین کا، لہٰذا اس کو نکاح کا عمل سمجھنا بدعت ہے، ہاں اگر کسی نوشہ کے بارے میں پتہ چلے کہ اس نے کفریہ کلمات ادا کیے ہیں تو احتیاطاً کہلوا لینا مناسب ہوگا، غالباً جس نے ان کی ابتداء کی ہوگی اس کا مقصد یہی رہا ہوگا، لیکن اب چونکہ اس کو لازم سمجھا جانے لگا ہے لہٰذا بلا وجہ نہ کہلوایا جائے۔ جہاں تک نکاح کے لیے دوسری ضروری چیز یعنی شرائط کا تعلق ہے تو ان پر عمل کسی کے لیے بھی دشوار نہیں ہے، مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ نکاح کے دو مرد عاقل، بالغ اور مسلمان گواہ ہوں، دو مرد نہ ملیں تو انہیں صفات کے ساتھ ایک مرد اور دو عورتیں بھی گواہ بن سکتیں ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جس عورت سے نکاح کر رہا ہے اس سے نکاح کرنا ناجائز نہ ہو یعنی وہ عورت اس کی ماں، بہن بھانجی بھتیجی خالہ پھوپھی وغیرہ نہ ہوں، جہاں تک مہر کا تعلق ہے تو یہ بھی نکاح میں شوہر پر لازم ہوتا ہے لیکن اگر اس کا ذکر نہ کرے یا صراحت کرے کہ نہیں دیں گے تب بھی لازم ہو جاتا ہے، ان دونوں صورتوں میں مہر مثل یعنی اس عورت کی پھوپھی، بہن اور باپ کی طرف سے دوسری عورتوں میں جو اس سے مشابہت رکھتی ہو، اس کا مہر دیکھا جائے اور اس کے مطابق دیا جائے، مہر کی کم از کم مقدار دس درہم (۶۱۸/۳۰ گرام چاندی) مقرر کی گئی ہے، زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے، لیکن اس میں ضرورت سے زیادہ اضافہ کرنا پسند کیا گیا ہے۔

مرد کے لیے بیوی سے خلوت کے بعد ولیمہ کو بھی مسنون قرار دیا گیا ہے، لیکن اس میں بھی طاقت سے زیادہ اسراف ناپسندیدہ ہے۔

یہ ہے اسلامی نکاح کے مختصر احکام ان کو دیکھئے پھر رائج رسوم کا جائزہ لیجئے، دونوں میں کوئی مناسبت ہی معلوم نہیں ہوتی، اللہ ہمیں سنت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی توفیق دے۔

اعتراف قصور

محمود حسن حسنی ندوی

اعتراف قصور وہ عمل ہے جو اللہ کو بڑا محبوب ہے، یہ آدمی عمل ہے اور دراصل انسان کا فطری عمل ہے، ابلیس لعین نے تاویل توجیہ کی تھی اور اپنے عمل کو کہیں نہ کہیں سے درست قرار دینے کا طرز اختیار کیا تھا چنانچہ وہ رحمت الٰہی سے ہمیشہ ہمیش کے لیے نہ صرف محروم کردیا گیا، سیدنا آدم علیہ السلام نے اعتراف قصور کیا، اور اپنے قصور کو اپنا ہی کھلا ظلم قرار دیا، اور اس پر رحمت ومغفرت کے اس طرح طالب ہوئے کہ اسکے بغیر سراسر نقصان ہی ہاتھ آئے گا، یہ ایسا آدمی عمل تھا کہ ذریت آدم کے برگزیدہ بندوں انبیاء اولیاء اصفیاء نے اختیار کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، کتنوں کے واقعات خود قرآن حکیم میں اللہ ذو الجلال والاکرام نے بیان کردئے ہیں، صرف ایک مثال انبیاء ورسل میں حضرت یونسؑ کی ہی لے لی جائے کہ جب انہوں نے کہا "لآ الٰـہ الّا انت سبحـانک إني كنت من الظالمين" تو اللہ ذو الجلال والاکرام کو ایسا پیار آیا کہ انہیں مچھلی کے پیٹ سے باہر کردیا اور مچھلی نے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ انہیں ساحل سمندر کو پہنچادیا، اولیاء واصفیاء کی زندگیوں میں بھی یہ بات کھلے طور پر نظر آتی ہے، صحابہ کی زندگی ہو یا ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور بعد کے اولیاء واقطاب اور سبھی مقربین بارگاہ ایزدی کے پاس اعتراف قصور کا یہ لمحہ ضرور نظر آئے گا۔ اس آخری دور میں عالم اسلام کی مقبول ترین اور محبوب ترین ہستی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو تنہائیوں میں بڑی الحاح وزاری سے یہ کہتے سنا: "ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفرلنا و ترحمنا لنكونن من الخاسرين" اور کبھی کوئی نیک معمول متاثر ہوتے دیکھا تو پھر اس کیفیت سے لرزہ براندام دیکھا کہ آج کیا چوک ہوگئی، کونسی غلطی ہوئی، کیا گناہ ہوگیا کہ یہ صورت حال پیش آئی، اور ان کی ہمشیرہ مرحومہ، والدہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کو ان کے انتقال سے چند گھنٹے قبل دیکھا کہ وہ عجیب کیفیت میں یہی دعا جو حضرت آدم اور حوا نے مانگی تھی بار بار پڑھے جارہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ نے پوری انسانیت پر کیسا احسان فرمایا کہ یہ دعا اللہ سے مانگی۔ اپنے اعمال کا محاسبہ، اپنی کمیوں کا احساس، اپنے قصور کا اعتراف انسان کو بڑی بلندیوں تک پہنچاتا ہے، اور ایک ہی لمحہ میں بندہ کہیں سے کہیں پرواز کرجاتا ہے، وہ ظاہر میں زمین پر ہوتا ہے مگر باطن میں وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہوتا ہے، اس کی روحانی پرواز اسے سکنڈوں میں عرش معلیٰ تک پہنچادیتی ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ اس کی بہترین معراج ہے، ایک بڑے عارف حضرت مولانا شاہ محمد حسن امرتسریؒ کی حکیمانہ وعارفانہ بات ان کے ہی صاحبزادے مولانا شاہ فضل الرحیم صاحب مدظلہ خلیفہ حضرت شاہ نفیس الحسینیؒ نے سنائی کہ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی ذریعہ سے کسی کو کسی عمل سے مقامات قرب عطا فرماتا ہے، لیکن ہم جیسوں کے لیے توبہ کا راستہ اور اعتراف قصور کا دروازہ رکھا ہے، اور خیر التابعین حضرت حسن بصریؒ نے مومن کے اخلاق بیان کرتے ہوئے بڑی ناصحانہ بات فرمائی: "إن احسـن استبشـر و إن أسـاء استغفر" (کہ جب اچھی بات صادر ہوتی ہے تو وہ ہشاش بشاش ہوتا ہے اور اس کا دل کھل اٹھتا ہے اور جب غلطی اور چوک ہوتی ہے تو اعتراف قصور کرتا ہے اور معافی کا خواستگار ہوتا ہے) لیکن نیک بندوں اور اہل ایمان ودین کے ساتھ اس کا معاملہ ان کو ان کی معمولی چوک پر تنبیہ کا ہوتا ہے، اور استغفار واعتراف قصور کی توفیق ملتی ہے، کبھی دوسروں کے طرز عمل اور سلوک وبرتاؤ کے بدلاؤ سے تنبیہ کی جاتی ہے، اور کبھی کسی اور ذریعہ سے کبھی کسی دنیوی نقصان اور جاہ ومال کے امتحان سے۔

اہل اللہ کا شیوہ ہے کہ وہ اپنے محاسن وفضائل اور مناقب واوصاف و خصائل حسنہ کو اللہ کا فضل گردانتے ہیں، اور بار بار شکر بجالاتے رہتے ہیں، جب کہ کوتاہی کمزوریوں اور خطاؤں کو اپنا ذاتی ظلم قرار دیتے ہیں، اور دوسروں پر الزام نہیں دھرتے، ایک واقعہ ایک عارف وشیخ کا مربی جلیل مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ایک عارف کی زبانی سنایا کہ "حیدرآباد میں ایک بزرگ کے گھٹنے میں درد ہوگیا تھا، تو میں اس میں قیروطی مل رہا تھا (جو وجع مفاصل اور جوڑوں کے درد کے لیے مفید ہے) ان کے خدام، معتقدین، مریدین جن کا بڑا حلقہ تھا، جب مجلس میں بیٹھے تھے، خاموش مؤدب، بالکل معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں: "كأن على رؤوسهم الطير" حضرت فرماتے ہیں سب سنتے ہیں، اس دن معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی کہ ایک یہاں سے بولا، ایک نے بات کہی، ایک نے اس کو کاٹا، کسی نے اس کو جواب دیا، اور بالکل معلوم ہوتا کہ بزرگوں کی مجلس نہیں ہے، ہم کسی منڈی میں پہنچ گئے ہیں، مچھلی بازار یا سبزی منڈی میں ادھر سے شور، ادھر سے شور، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ آج ہوا کیا؟ آج یہ کیا نئی بات ہے کہ یہاں بزرگ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ بنفس نفیس موجود، لیکن آج معلوم ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو احساس ہی نہیں کہ بزرگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے میرا استعجاب وحیرت دیکھی تو گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، میں سمجھا کہ یہاں درد زیادہ ہورہا ہے، تو میں وہاں ملنے لگا، پھر مجھے تعجب ہوا کہ لوگ اب بھی خاموش نہیں ہو رہے ہیں، تو انہوں نے پھر گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، تو میں ادھر ملنے لگا، میں نہیں سمجھا کہ کیا بات ہے، اس وقت وہ بزرگ میرے کان کے پاس منھ لائے، اور فرمایا کہ گھٹنے کے درد کی وجہ سے میں رات کے معمولات پورے نہیں کرسکا ہوں، اس کی بے برکتی اور اس کی نحوست ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ مولانا علی میاں ندوی فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا جب یہ نتیجہ محفل پر ہوا تو کثیر التعداد خواص کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ ماحول اور معاشرہ پر ہوگا، اب آپ ضرب لگائیے کہ ایک کا اثر اتنا تو چار کا کتنا، آٹھ کا کتنا، پچاس کا کتنا" (مأخوذ از تحفۂ کشمیر)

اس لیے معاشرہ کی اصلاح، سماج کی درستگی، قوموں کی فلاح، انسانوں کی نجات سب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے قصور پر نظر رکھے، اور اپنا محاسبہ جاری رکھے، خصوصاً خواص امت کی ذمہ داری اس کے تئیں بہت بڑھ جاتی ہے کہ ان کی حیثیت وہی ہے جو جسم میں دل کی اور دماغ کی ہوتی ہے، دوسرے اگر ہاتھ پیر ہیں تو ان کا مقام سر کا ہے، اور اگر اعتراف قصور اور استغفار نہ ہو تو اس کا خمیازہ بھی سخت بھگتنا پڑتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بڑے پتہ کی بات فرمائی ہے کہ "قانون الٰہی یہ ہے کہ "من يعمل سوٓء يجزبه" (جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ ملے گا)، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غداری اور بے وفائی کا، انتشار کا، اختلاف کا، بے عملی کا، دولت پرستی کا، اقتدار پرستی کا، سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ ایک جزا ہے، جس میں کوئی استثناء، رورعایت، جنبہ داری نہیں" (تحفۂ کشمیر)

عدل کے پیغمبر ﷺ

محمد سمعان خلیفہ ندوی

اللہ کے آخری رسول جو دین لے کر آئے وہ انتہائی متوازن، روحانیت اور مادیت کا حسین امتزاج، زندگی کے تقاضوں سے نہ مکمل بے پروا، اور نہ ہی مادیت کا نقیب، انسانیت کو ''سواء السبیل'' دکھاتا ہوا، زندگی کے تقاضے انسان کو بچکولے نہ دے سکیں اور وہ کسی موڑ پر لڑھک نہ جائے، اس لیے اس کے اقوال وافعال اور احساسات کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اعتدال بخش کر ایک متوازن انسان بناتا ہوا، یہ ہے دین اسلام کی خصوصیت ''وذٰلک دین القیّمة''۔ عدل دراصل اسی توازن کا نام ہے، انصاف کی کسوٹی چونکہ اعتدال وتوازن کا معیار ہے، اسی لیے اسے عدل کا نام دیا گیا۔

پیغمبر اسلام' اسلام کی دعوت کا کامل نمونہ تھے، آپ کی زندگی اور آپ کی دعوت دونوں ہی میں اس عدل واعتدال کی جلوہ آرائی ملتی ہے۔ ایک دیہاتی بڑے ہی کھرّے انداز میں آپ سے اپنے حصے میں اضافہ کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے: اے محمد! انصاف سے کام لو! آپ فرماتے ہیں: ''ارے! پھر کس سے انصاف کی امید لگائی جائے اگر میں عدل نہ کروں''! اس دیہاتی کو اتنی ہمت اسی وجہ سے تو ہوئی کہ آپ نے تفریق وامتیاز کے تمام مظاہر کو ''إنما أنا بشر مثلکم'' کہہ کر یکلخت ختم کر دیا تھا، اور یہی امتیاز اور برتری کا احساس ہے جس کا نتیجہ اخیر میں ظلم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ایک اجنبی ہانپتا کانپتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو آپ اس کے بازو پر اپنا دستِ شفقت رکھ کر فرماتے ہیں: اپنے کو ہلکان نہ کرو، میری ماں تو مکہ میں قدید (سوکھے گوشت کے ٹکڑے) کھایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ مشورہ ہوا تو آپ نے لکڑیاں جمع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر بھی لی، صحابہ کے یہ کہنے پر کہ ہم اس کام کے لیے کافی ہیں، آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے لیے کافی ہو لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ تم پر مجھے اپنی برتری کا احساس ہو۔

عدل زندگی کی میزان ہے، اس میزان کا ادنیٰ جھکاؤ بھی دنیا کو جہنم زار بنا سکتا ہے اور زندگی کا مزہ کرکرا کر سکتا ہے اس لیے آپ عدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے، صرف اس ڈر سے کہ کہیں اللہ کے یہاں پکڑ نہ ہو جائے، ایک دن کسی معمولی کام سے اپنے کسی خادم کو بھیجا، اس نے تقریباً آدھا دن لگا دیا، تو شریف انسانوں کی طرح آپ ﷺ کو بھی غصہ آیا، دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اب خیریت نہیں، لیکن جب خادم لوٹتا ہے تو رسول اللہ کے دہنِ مبارک میں مسواک تھی، فرمایا: ''اگر اللہ کے یہاں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو تم کو اس مسواک سے مارتا!'' (مسواک کتنی معمولی لکڑی! لیکن اس سے بھی مارنا آپ نے پسند نہیں کیا)۔

عدل کا نبوی تصور بہت ہی اعلیٰ تھا، انسانوں کی خوبی سے بڑھ کر یہ الٰہی اخلاق کا مظہر تھا، چونکہ حدیث قدسی میں اللہ عزوجل نے فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم حرام کیا اور تمھارے درمیان بھی اس کی حرمت ٹھیرا دی، اس لیے اب تم آپس میں ظلم روا نہ رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول کے نزدیک ظلم وہ برائی ہے کہ دوسری کوئی برائی اس کے برابر نہیں، اسی لیے فرمایا کہ ظلم سے بچو، قیامت کے دن ظلم کو تاریکیوں کی شکل دی جائے گی۔ مظلوم کی بددعا سے بچو، اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ مظلوم کی بددعا کو حق تعالیٰ بادلوں کے اوپر اٹھا کر آسمانوں کے دروازے اس کے لیے کھولتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: میرے اقبال کی قسم میں ضرور تیری مدد کروں گا چاہے تھوڑے وقت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ ظالم کو آخرت کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا: جہاں تک ہو سکے ظلم سے بچو، بندہ اپنی نیکیوں کے ساتھ محشر کے میدان میں آئے گا اور یہ خیال کرے گا کہ یہ اس کو نجات دلائیں گیں، اتنے میں دوسرا بندہ فریاد کرے گا اور کہتا رہے گا کہ پروردگار! تیرے اس بندہ نے مجھ پر ظلم کیا تھا، ارشاد ہوگا: اس کی نیکیاں مٹائی جائیں، یہی ہوتا رہے گا یہاں تک کہ اس کی کوئی نیکی باقی نہ رہے گی۔ اسی وجہ سے عدل کی انتہائی فکر آپ ﷺ کو دامن گیر رہتی تھی، کبھی منبر پر کھڑے ہو کر فرماتے تھے: ناحق جس کا میں نے مال لیا ہو تو یہ میرا مال حاضر ہے، ناحق کسی کی پیٹھ پر اگر کوڑے لگائے ہوں تو میری پیٹھ حاضر ہے وہ بدلہ لے لے۔

ظلم کے سرچشمے کے اعتبار سے ظلم کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں، سب سے بڑا ظلم کا سرچشمہ ظالم وجابر فرماں روا ہے اس لیے اس کے سامنے حق بات کے اعلان کو آپ نے ''أفضل الجهاد'' قرار دیا، مظلوم کو مقابلہ پر آمادہ کیا، ظالم کا ہاتھ روکنے کی امت کو دعوت دی، ورنہ ظالم کو ظالم نہ کہنے پر اللہ کی طرف سے اس کے سخت وبال اور عذاب سے ڈرایا۔ ظلم کی ہر شکل کو آپ نے سختی سے روکا، چاہے زبان کا ظلم ہو، ہاتھ کا ہو، یا احساسات کا۔ ہاتھ کے ظلم کی سب سے قبیح شکل یہ ہے کہ معصوم انسانی جان کا خون بہایا جائے، اس کے متعلق فرمایا کہ پوری دنیا کی ہلاکت اور تباہی اللہ کے نزدیک اس سے بڑی نہیں کہ ایک انسان کو ناحق قتل کیا جائے، اور ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگر آسمان وزمین والے سب مل کر بھی کسی کا قتل کریں تو سب کو حق تعالیٰ عذاب دے گا، اور سب کو جہنم میں اوندھے منھ ڈال دے گا۔ قتل تو دور کی بات، صرف اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا بھی رسول اللہ کے نزدیک وہ جرم ہے جس پر انسان ملائکہ کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔ زنا کاری (آبرو کا خون) بھی انسانی جان کا ایک طرح سے قتل ہے، اس لیے کسی بھی صورت میں آپ نے اس کی اجازت نہیں دی، اجازت چاہنے والے نے اجازت چاہی تو اس کو عربوں کی غیرت دلائی کہ کیا تم اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے لیے اس بات کو پسند کرو گے؟ پھر کیوں دوسروں کے لیے پسند کرتے ہو!!

زبان کے ظلم سے بچاتے ہوئے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ پیر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، زبان کے عدل کی جتنی شکلیں ہو سکتی ہیں اس کی ترغیب دی، اور زبان کا ظلم 'ایذاءِ غیر، جھوٹی گواہی یا کسی بھی شکل میں سامنے آئے سب پر نکیر فرمائی۔ اسی کے ساتھ جذبات واحساسات کی پاکیزگی کی آپ نے دعوت دی، کینہ کپٹ، دشمنی وعداوت، بدگمانی وحسد، کسی کو مصیبت میں دیکھ کر ہنسنا، دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، کسی کو عار دلانا، یہ سب احساسات کا ظلم ہے، ظلم کی اس قسم پر بھی آپ نے بند باندھا۔

عدل کا مخالف ظلم ہے، ظلم کی یہ سب شکلیں تو دوسروں کے ساتھ ہوئیں، ایک ظلم اور ہے جسے عموماً ظلم نہیں سمجھا جاتا، اور وہ سب سے بڑا ظلم ہے، انسان کا اپنے اوپر ظلم، جان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک امانت ہے، اس نے انسانوں کو بے کار پیدا نہیں کیا، اب اس امانت کی لاج نہ رکھ کر اسے ضائع کر دینا، چاہے مایوسی کا شکار ہو کر خودکشی کر لینا ہو، یا کسی جوش میں آکر اپنے کسی عضو کو معطل کر دینا ہو، یا پھر گناہوں میں ڈوب کر (اور سب سے بڑا گناہ ہے اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنا) اپنی ہلاکت کا سامان کرنا، یہ سب اللہ کی دی ہوئی امانت کا خیال نہ رکھ کر اپنے اوپر ظلم کرنا ہوا، ان تمام راستوں کو پیغمبر اسلام ﷺ نے بند کر دیا۔

عالمی معاشی بحران

اسباب اور حل

محمد نفیس خاں ندوی

امریکہ کا معاشی بحران نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کی معیشت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، اس بحران کی سنگینی سے نپٹنے کے لیے مغربی ماہرین اقتصادیات و پالیسی ساز ابھی تک کوئی ٹھوس حل نہیں پیش کر سکے۔ اس بحران کا اثر انسانوں کے ہر طبقہ میں ظاہر ہوا، تمام ممالک اپنے طور پر اس سے نبرد آزمائی کے لیے کمر بستہ ہیں لیکن اس کے بنیادی اسباب اور اس سے باہر نکلنے کے ٹھوس ذرائع سے یکسر چشم پوشی کر رہے ہیں۔

حالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس عالمی بحران کی ابتدا اس وقت ہوئی جب امریکی بینکوں اور Financial Institutions نے ریئل اسٹیٹ (Real Estate) یعنی گھر اور آراضی وغیرہ کی خریداری کے لیے لوگوں کو قرضے فراہم کیے، یہ قرضے معاشرہ کے اس غریب طبقہ کو بھی فراہم کیے گئے جن کے ماضی میں مالی معاملات (Financial Credit) درست نہیں تھے، اور وہ گھروں کی خریداری کے لیے مارٹگیج (Mortgage) حاصل کرنے کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، اس طبقہ کو امریکی کریڈٹ کی اصطلاح میں Sub- Prime کیٹیگری کہا جاتا ہے، ا بینکوں نے زیادہ منافع حاصل کرنے کی لالچ میں اس طبقہ کو خوب قرضے دیے، اور شرح سود بھی دوسروں سے مقابل زیادہ رکھی، ساتھ ہی انھیں یہ یقین بھی تھا کہ اگر یہ طبقہ قرضے واپس نہیں کر سکا تو انشورنس کمپنیاں ان بینکوں کا نقصان پورا کر دیں گی۔ چنانچہ امریکی ساہوکاروں نے اس طبقہ سے بھی سود بٹورنے کا ارادہ کیا، چنانچہ ۱۹۹۷ء تک Sub- Prime کا حجم پھیل کر ۱۳ء۱ ٹریلین ڈالر ہو چکا تھا، اور پھر جب اس طبقہ کی اکثریت قرض کی ادائیگی میں ناکام ہوئی تو اس نے بینک کو قرض پر لیے گئے گھر اور زمینیں بینک کے حوالہ کر دیں، اور پھر خیموں میں لوگ خیموں میں رہنے میں مجبور ہو گئے، امریکی شہر لاس اینجلس سے مشرق وسطی کی طرف ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہزاروں لوگ خیمہ میں رہائش پذیر ہیں، اب تو اس علاقہ کو ''ٹینٹ سٹی'' (Tent City) کا نام بھی دے دیا گیا ہے۔ اور پھر اس طرح ایک شدید بحران نے جنم لیا، رئیل اسٹیٹ کی قیمتیں کوڑیوں کے بھاؤ آگئیں، نتیجتاً بینک ان گھروں اور آراضی کو بیچ کر بھی وہ رقم نہ حاصل کر سکے جو انھوں نے قرض کی شکل میں دیے تھے، اور یوں مالی بحران نے جنم لیا پھر نہ صرف مختلف بینک دیوالیہ ہوئے بلکہ بے شمار انشورنس کمپنیاں بھی دیوالیہ ہوئیں۔

یہ بحران صرف بینکوں تک ہی محدود نہیں رہا کیونکہ بینکوں نے ان قرضوں کو پروڈکٹس کی شکل میں اسٹاک مارکیٹ میں بھی فروخت کیا تھا، گلوبلائزیشن کے اس دور میں امریکہ کے رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں یورپ اور دیگر ممالک کے بینکوں نے بھی سرمایہ کاری کر رکھی تھی، اس طرح یہ بحران پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا، گویا امریکہ کی چھینک کے نتیجہ میں پوری دنیا نزلہ میں مبتلا ہو گئی۔

دنیا کے اس معاشی بحران نے امریکی سرمایہ دارانہ نظام کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں، اور اگر اس سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت کا بغور جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظام اگر ابھی تباہ نہیں ہوا تو تباہی کے دہانے پر ضرور پہنچ چکا ہے، ماہرین اپنی تدبیروں سے اسے کچھ وقت کے لیے سنبھالا تو دے سکتے ہیں لیکن تباہی سے بچانا ناممکن ہے، اس نظام کی مختلف خرابیوں میں سے چار بنیادی ہیں جن کی وجہ سے اس نظام کا یہ انجام ہونا یقینی تھا، وہ بنیادی اسباب حسب ذیل ہیں:

(۱) کرنسی کو سونے سے منسلک کرنے کا خاتمہ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بریٹن ووڈ (Bretton wood) معاہدہ کے تحت ڈالر کو سونے کے مقابلے میں کرنسی کے معیار کے طور پر متعارف کرایا جانا، اور پھر ستر کی دہائی کے شروع میں کرنسی کے معیار کی حیثیت سے ڈالر کا سونے کی مکمل جگہ لے لینا، اس کا نتیجہ ہے کہ عالمی معیشت، امریکہ کو پہنچنے والے کسی بھی معاشی دھچکہ کی زد میں ہے، کیونکہ دنیا کے تمام نہیں تو بہت سے ممالک کی کرنسی سونے کے بجائے ڈالر سے منسلک ہے، جبکہ ڈالر کی حیثیت کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں جس کی چھپائی امریکہ میں ہوتی ہے۔

(۲) سود پر مبنی قرضے۔ جس کا لازمی نتیجہ شدید اقتصادی مشکلات کا جنم ہے۔

(۳) اس نظام میں شیئرز کی خرید و فروخت اور سامان تجارت (Financial Commodities) کی خرید و فروخت میں اصل ملکیت کا حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا، پروڈکٹ کئی مرتبہ آگے آگے فروخت ہو چکا ہوتا ہے جبکہ ابھی وہ اپنے پہلے مالک کے پاس ہی پڑا ہوتا ہے، اس صورت میں قیمت اوپر نیچے ہو رہی ہوتی ہے، جس سے مارکیٹ کو دھچکے لگتے ہیں، اور یوں speculation (تخمینہ) کے ذریعہ نفع نقصان حاصل ہوتا ہے، اور بالآخر معاشی بحران جنم لیتا ہے۔

(۴) سرمایہ دارانہ نظام کے حاملین کا حقیقی ملکیت (Ownership) سے بے بہرہ ہونا۔ چنانچہ ملکیت کا حق ریاست کے بجائے پرائیوٹ سیکٹر کے پاس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مخصوص اثاثہ جات پر چند ملٹی نیشنل کمپنیوں یا مخصوص افراد کی اجارہ داری ہوتی ہے جس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، مثلاً تیل کی ملکیت چند کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے اس کا خمیازہ پوری انسانیت کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دنیا نے اس سے قبل کمیونسٹ آئیڈیالوجی کا مشاہدہ کیا اور اب سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی ہلاکت کی کگار پر ہے، اس کے مقابل اسلام کا بتلایا ہوا معاشی نظام ہی ہے جو اس طرح کے معاشی بحران کو جنم لینے نہیں دیتا کیونکہ جن بنیادوں کی وجہ سے ایسے بحران رونما ہوتے ہیں اسلام میں ان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اسلام یہ لازم کرتا ہے کہ سونے اور چاندی کو کرنسی کے معیار کے طور پر اختیار کیا جائے، جاری کردہ کوئی بھی پیپر کرنسی مکمل طور پر سونے اور چاندی پر منحصر ہونی چاہیے۔

اسلام سود کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اس بات کو لازم کرتا ہے کہ قرضے ضرورت مندوں کو مدد دینے کے لیے فراہم کیے جائیں اور ان پر کسی قسم کا سود (Interest) عائد نہ کیا جائے۔

اسلام نے خریدار کی طرف سے مال کو اپنے قبضے میں لینے سے قبل آگے فروخت کرنے سے منع کیا ہے نیز ایسی اشیاء کی خرید و فروخت بھی ممنوع کی ہے جو ابھی وجود میں نہ آئی ہوں اس لحاظ سے فیوچر ٹریڈنگ (Future Trading) کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ مزید برآں Speculative تجارت کی بھی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔

اسلام اس سے بھی منع کرتا ہے کہ کوئی فرد/ کمپنی ان اشیاء کا مالک بن جائے جو عوامی ملکیت کے زمرے میں آتی ہیں مثلاً پیٹرول، معدنیات، توانائی اور بجلی کے ذرائع وغیرہ، ان اشیاء کی دیکھ ریکھ اور تقسیم حکومت کے ذمہ ہوگی۔

یوں اسلام کا نظام معیشت ان تمام معاشی مسئلوں کو جنم لینے نہیں دیتا جو سرمایہ دارانہ معاشروں میں وقتاً فوقتاً وجود میں آتے رہتے ہیں، اور اگر اب بھی اس اسلامی نظام کو نہ اختیار کیا گیا تو ایسے شدید بحران آئے دن رونما ہوتے رہیں گے۔